ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

# سابق گورنر جنرل غلام محمد نوراللہ مرقدہٗ

ویسے تو پاکستان بے شمار مسلمانوں کی قربانیوں سے وجود میں آیا۔ کسی نے جانی قربانی کی اور کسی نے خانماں برباد ہونا ایمان اور جذبۂ ملّی کی بدولت قبول کیا۔ بہت سے عہدہ داروں نے اس کی تعمیر میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ لیکن عقل وہمت وایمان سے اس کی بنیادوں کو استوار کرنے والے ذی اقتدار معماروں میں سے اگر گراں مایہ خدمات کی بنا پر چار پانچ اشخاص منتخب کئے جائیں تو اس صف میں یقیناً غلام محمد مرحوم کو ایک نمایاں مقام حاصل ہوگا۔ ان میں زیادہ تعداد سرسیّد کے ایم اے او کالج علی گڑھ کی تعلیم یافتہ ہے۔ غلام محمد بھی علی گڑھ کے قدیم طلباء میں سے تھے۔ کالج میں وہ مجھ سے ایک سال پیچھے تھے۔ میں ۱۹۱۳ء میں علی گڑھ کو چھوڑ کر سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخل ہوگیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فلسفے کی تعلیم کا انتظام علی گڑھ کی نسبت یہاں بہتر تھا۔ اب پروفیسر ارنلڈ علی گڑھ چھوڑ کر لاہور گورنمنٹ کالج میں آگئے تھے اور ان کے بعد ایک ایسے انگریز پروفیسر فلسفہ پڑھاتے تھے جن سے طلباء فلسفہ مطمئن نہ تھے۔ غلام محمد آخر تک علی گڑھ ہی میں رہے۔ وہیں سے ایم۔ اے پاس کرکے کچھ عرصہ لیکچرار بھی ہوگئے۔ اس وقت کے معاصر طلباء میں سے جناب زاہد حسین بھی تھے جو اب پلاننگ بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں اور اس سے قبل چوٹی کے کلیدی عہدوں پر پاکستان کی تن دہی سے خدمت کر چکے ہیں۔ غلام محمد اور زاہد حسین دونو آڈٹ اینڈ اکونٹس کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوکر گورنمنٹ آف انڈیا کی ملازمت میں چلے گئے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت یہ دونو حکومت ہند میں بہت مقتدر عہدہ دار تھے۔ ان دونوں کے دوستانہ روابط نہایت بے تکلفانہ اور گہرے تھے اور یہ دونو مجھ سے بھی بہت کچھ بے تکلّف تھے۔ ان دونوں میں آپس میں بہت کچھ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ ایک مرتبہ کراچی میں زاہد حسین صاحب کے گھر پر میری موجودگی میں غلام محمد کہنے لگے کہ بھائی یہ زاہد بہت ڈرپوک اور بے وقوف آدمی ہے۔ ہم دونوں آخر میں ایسی کلیدی آسامیوں پر متعین تھے کہ کروڑوں روپوں کے سودے اور ٹھیکے ہمارے اختیار میں تھے۔ ہم لوگ بے کھٹکا دس بیس لاکھ روپے کمیشنوں میں اپنی جیب میں ڈال سکتے تھے جسے لوگ رشوت بھی نہیں سمجھتے اور نہ ہی ہمیں کوئی پکڑ سکتا تھا۔ لیکن اس زاہد نے ہمیں کچھ نہ کرنے دیا۔ کبھی کہتا تھا کہ

بھائی یہ لاکھوں روپے رکھینگے کہاں۔ کبھی کہتا تھا کہ راتوں کی نیند غائب ہوجائیگی کبھی ایمان بے ایمانی کی بحث لگا دیتا تھا۔ غرضیکہ اس نے نہ خود کچھ کیا اور نہ ہمیں کچھ ہاتھ رنگنے دئے۔ اور دونوں کے دونوں مفلس کے مفلس پاکستان پہنچ گئے۔

اب میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ غلام محمد صاحب سے خود سُنی ہوئی باتیں ہیں یا ان کے متعلق میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد غلام محمد صاحب سے میل ملاقات کا تو موقع نہ رہا۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر یو۔ پی میں رہے یا دہلی میں اور میں عثمانیہ یونیورسٹی کی تاسیس کے وقت فلسفہ کا پروفیسر ہوکر حیدرآباد دکن چلا گیا۔ اور عمر کا بہترین اور طویل حصّہ میں نے وہیں گزار دیا۔ لیکن اس طویل زمانی اور مکانی دوری میں نہ وہ مجھے بھولے اور نہ میں انہیں بھولا۔ یہاں تک کہ وہ وزیر فینانس ہوکر حیدرآباد دکن آگئے اور اُن سے قریبی رابطہ دوبارہ قائم ہوگیا۔ انگریزی حکومت کی ملازمت میں بھی میں ان کے دبنگ پن کے کئی واقعات سُن چکا تھا۔ لیکن حیدرآباد میں اپنے سامنے ان کی صلاحیت اور جرأت کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔ دیسی ریاستوں میں انگریز عہدہ دار اس قدر رعب اور وقار سے رہتے تھے جو ان کو برٹش انڈیا میں بھی حاصل نہ تھا۔ غلام محمد صاحب کو بھی اُنہوں نے دیسی آدمی سمجھ کر اکڑفوں شروع کی تو غلام محمد صاحب نے ان کو ایسی ڈانٹ پلائی جیسے کوئی اپنے گستاخی کرنے والے ملازم کو ڈانٹتا ہے۔ نظام ریلوے کے جنرل منیجر ایک صاحب سلاٹر تھے جو اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتے تھے، غلام محمد صاحب کی ایک ڈانٹ کے بعد وہ دبک کر رہ گئے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ غلام محمد صاحب اپنے فن کے ماہر تھے اور کوئی بےعنوانی ان کی نظر سے اوجھل نہ رہتی تھی۔ جو شخص پوری معلومات رکھتا ہو اور تفصیلات پر حاوی ہو اس کے سامنے دوسروں کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ انگریز عہدہ داروں کے علاوہ حیدرآباد میں فراعنہ کا ایک گروہ بھی تھا اور وہ جاگیردار، نواب اور درباری تھے۔ ان میں سے بعض رشوت خوار اور ریشہ دوانیوں میں ماہر تھے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار یہاں تک کہ سر اکبر حیدری بھی ان کو خوش کرنے میں کسی اُصول کی پابندی نہ کرتے تھے۔ رئیس مملکت خود نہایت درشت مزاج اور زر پرست انسان تھا۔ اپنے ذاتی مفاد کے سامنے ملک و ملّت کا مفاد اس کے لئے کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ غلام محمد صاحب نے اس گروہ کو بھی ڈرایا اور دھمکایا اور اکڑنے والے عہدہ داروں کی اکڑ کو توڑ دیا۔ اس معاملے میں دیسی ہو یا انگریز غلام محمد اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی انگریز ان سے بہت گھبراتے تھے۔ فرماتے تھے کہ حکومت ہند میں جب میں جائنٹ سکریٹری تھا وردی اور تمغوں سے لیس ایک انگریز فوجی افسر (غالباً کوئی بریگیڈیر تھا) بے اطلاع میرے کمرے میں گھس آیا۔ میری میز کے سامنے ایک کرسی پر ایک پاؤں

رکھ کر مجھ سے مخاطب ہؤا۔ مجھے اس کی بے تمیزی پر بہت غصہ آیا۔ میں نے برافروختہ ہو کر کہا تم کون ہو اور کچھ جواب دینے سے پہلے یہ اپنا شُو زمین پر رکھ کر بات کرو۔ قیام پاکستان کے بعد جو انگریز عہدہ دار یہاں رہ گئے تھے جب انہوں نے سُنا کہ غلام محمد فینانس منسٹر ہو کر آرہے ہیں تو آپس میں کہنے لگے کہ اس شخص سے ہماری نہ بنے گی اور یہ ہمیں نکال کر ہی چھوڑے گا۔ برٹش حکومت سے اس قسم کی کش مکش سے تنگ آ کر وہ ایک مرتبہ مستعفی بھی ہو گئے تھے۔ کافی عرصہ الگ رہنے کے بعد پھر ان کو حکومت ہند نے واپس بلا کر ایک اونچے عہدے پر متمکن کیا گیا۔ فرماتے تھے کہ بھائی زندگی میں اور قسم کی بدعنوانیاں بہتیری کی ہیں لیکن فرائض منصبی میں ہمیشہ دیانت اور ہمت سے کام لیا ہے۔ میرے نامۂ اعمال میں اس شعبے میں شاید کوئی گناہِ عظیم درج نہ ہو۔

پاکستان سے قبل ہی وہ اپنے فن میں اس قدر ماہر مشہور ہو گئے تھے کہ حیدر آباد کی وزارت کے بعد ٹاٹا کی مشہور کمپنی نے کوئی چھ سات ہزار ماہوار تنخواہ اور بہت سی رعایات دے کر غالباً بحیثیت انچارج فینانس رکھ لیا تھا۔ جب ہندوؤں نے مجبور ہو کر پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا تو ان کی کوشش تھی کہ چوٹی کے قابل مسلمان پاکستان نہ جانے پائیں۔ مشہور کتاب ورڈکٹ ان انڈیا کے مصنف بورلے نکلز نے مسلمان لیڈروں کو پہلے سے ایک مضمون میں آگاہ کر دیا تھا کہ پاکستان بننے پر ہندو اس قسم کی کوشش کرینگے تم لوگ اس سے متنبہ ہو جاؤ۔ غلام محمد صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ غالباً پٹیل کے اشارے پر ٹاٹا والوں نے بہت کوشش کی کہ میں انہیں چھوڑ کر پاکستان نہ جاؤں۔ میری تنخواہ جو پہلے بھی بہت کافی تھی اس میں اضافہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور یہ کہا کہ اگر تم صحت اور علاج کے لئے امریکہ میں رہنا چاہو تو ہم تم کو امریکہ میں متعین کر دیں گے اور تنخواہ کے علاوہ وہاں رہنے کا کثیر الاؤنس بھی دینگے مگر پاکستان بننے کے بعد غلام محمد کہاں بھارت میں ٹکنے والے تھے۔ وہاں ان کو جو تنخواہ مل رہی تھی اس سے نصف تنخواہ پر قائد اعظم کے مدعو کرنے پر وہ پاکستان آگئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے جس قابلیت اور جرأت سے یہاں کی مالی حالت کو سنبھالا ہے اس کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ ہندوستان نے ہر قسم کی کوشش کی کہ پاکستان دیوالیہ ہو کر بھارت کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ دنیا بھر کے ماہرین مالیات و معاشیات نے متحد الرائے ہو کر کہا کہ پاکستان ایک سال بھی قائم نہیں رہ سکتا لیکن بے زری اور بے سروسامانی میں بھی پاکستان نہ صرف قائم رہا بلکہ نہایت قلیل عرصے میں اس نے اپنا مالی اور معاشی وقار اور اپنی ساکھ دنیا میں قائم کر لی۔ اس میں بہت سے مردانِ کار کی عقلیں اور ہمتیں صرف ہوئیں لیکن فینانس اگر کسی اناڑی اور ڈرپوک انسان کے ہاتھ میں ہوتا تو ماتحت افسروں کی مجموعی کوششیں بھی اُس بحران

کے زمانے میں اس کو نہ بچا سکتیں۔ فینانس کے ایک بڑے افسر نے ایک روز مجھ سے کہا کہ اس شخص کی رندانہ جرأت نے کام کیا۔ اگر اس انقلابی دور میں کوئی شخص محض دفتری قسم کا ہوتا تو پاکستان کا سنبھلنا مشکل تھا۔ تمام محکموں کو آخر میں فینانس ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ غلام محمد صاحب کے زمانے میں کوئی عہدہ دار کوئی معاملہ پیش کرتے ہوئے یہ اُمید نہ رکھ سکتا تھا کہ وہ کسی خامی یا بدعنوانی کو ان کی خُرد بین نگاہ سے چھپا سکیگا۔ جہاں کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی وہ ایک ہی ڈانٹ سے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ خواہ وہ اپنے محکمے میں کتنا ہی مقتدر افسر ہو نجی اور شخصی زندگی میں بے انتہا لحاظ اور مروّت تھی لیکن مملکت کے معاملات میں ذرہ بھر کسی کا لحاظ نہ کرتے تھے اسی لئے وہ تلخ بیانی بلکہ بدزبانی میں بدنام ہو گئے تھے۔ ان کے ایک ماتحت نے جو ان سے بہت قریب رہ چکا تھا مجھ سے بیان کیا کہ یہ شخص ڈانٹتا بہت ہے لیکن کبھی کسی شخص کو محض ذاتی عناد یا غصّے کی وجہ سے نقصان نہیں پہنچاتا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے فائدہ ہی پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

## مذہبی اور ملّی جذبہ

عبادات و شعائر کے لحاظ سے تو غلام محمد نہ اپنے آپ کو مذہبی آدمی سمجھتے تھے اور نہ کوئی دوسرا ان کو مذہبی آدمی شمار کر سکتا ہے۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ان کے قلب کی گہرائیوں میں ایک غیر معمولی جذبہ موجود تھا۔ ویسے تو ہندو پاکستان کے مسلمان ہر مسلمان قوم کے متعلق برادرانہ جذبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے ترانۂ ملّی کا پہلا شعر :

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا  مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اسی تاثر کا اعلان اور اظہار رہے۔ لیکن ہمارے معاصر علی گڑھ کے نوجوانوں میں یہ تاثر غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ اس کا خاص محرک ترکوں کے ساتھ خاص ہمدردی تھی جنہیں تمام مغربی اقوام تباہ کرنے پر آمادہ تھیں۔ ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کی جنگِ عظیم سے قبل ہی ایک طرف بلقانی اقوام نے اور دوسری طرف اطالیہ نے ترکی ممالک محروسہ پر حملہ کر دیا۔ ابھی ترک اس حملے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ تمام فرنگ میں جنگ کی انسانیت سوز آگ بھڑک اُٹھی۔ ترکوں کا اس سے بچنا دشوار تھا۔ اُنہوں نے سوچا جرمنوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا اور نہ ہماری مملکت کے کسی حصّہ پر قابض ہونے کا منصوبہ ان کی سیاست میں دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے اصل دشمن انگریز اور ان کے سیاسی و عسکری حلیف ہیں۔ ترک جرمنوں کے حلیف ہونے کی حیثیت سے اس آگ میں کود پڑے۔ فرنگی سیاست کے قمار خانے میں ترکوں نے بھی اپنا پانسہ پھینکا :

خنک آں قمار بازے کہ بباخت ہر چہ بودش  ونہ ماند ہیچش الّا ہوسِ قمارِ دیگر

ہندوستان کے مسلمان نہایت درجہ مضطرب مگر بے بس تھے۔ انگریز ہندوستان کی مسلمان فوجوں کو ترکوں کے خلاف لڑانے کے لئے لے گئے۔ غلامی بھی کیا ضمیر کُش اور جذبات کُش لعنت ہے۔ انسانوں کے پیدا کردہ شر کو رفع کرنے کی بابت رسولِ کریمؐ کی ہدایت کس قدر مجاہدانہ اور سبق آموز ہے کہ شر کو اپنے قوتِ بازو سے رفع کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہو تو مجاہدانہ عمل سے اس کو رفع کرو۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ عمل کی گنجائش نہیں تو اپنی زبان سے اس کے خلاف جہاد کرو اور اگر زبان بندی تک نوبت پہنچ چکی ہے تو اپنے دل میں اسکی مذمت کرو۔ اور اس کے خلاف جذبہ پیدا کرو۔ لیکن یہ آخری صورت ایمان کی ضعیف ترین صورت ہے۔ علی گڑھ کے اس زمانے کے طلباء کے لئے فقط یہ آخری صورت ممکن رہ گئی تھی۔ اگرچہ مولانا محمد علی جوہر کی قسم کے قدیم طلبا نے کلمۂ حق کو ببانگِ دُہل تقریروں میں بھی کہنا شروع کیا اور تحریروں میں بھی اور اس جُرم میں تختۂ دار پر چڑھنے کے لئے تیار ہو گئے :

مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا　　دیکھئے کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

غلام محمد اسی دَور میں علی گڑھ کے طالب علم تھے۔ طلباء اس سے زیادہ کیا ایثار کر سکتے تھے کہ اپنا پیٹ کاٹ کر جو قلیل رقم جمع ہو وہ ترک مجاہدین کی حمایت کے لئے بھیج دیں۔ طالب علموں کو جو کھانا ملتا تھا وہ پہلے بھی کچھ تشفی بخش نہ تھا۔ چپاتی اور دال اور دو ایک بوٹیوں کے ساتھ کچھ ترکاری۔ کھانے کی مد میں طالب علم کو آٹھ روپے ماہوار دینا پڑتے تھے۔ ان آٹھ روپوں میں کم از کم دو روپے ٹھیکہ دار کا منافع اور باورچیوں کی لوٹ وضع کر لیجئے۔ اس سستے زمانے میں بھی مبلغ چھ روپے میں کیا مل سکتا تھا۔ طالب علموں نے اس زاہدانہ خوراک میں بھی کمی قبول کر لی۔ باقی بس چپاتی اور دال رہ گئی۔ اس ایثار سے جسمانی غذا کم ہو گئی لیکن روحانی غذا بڑھ گئی۔ ملّت کے لئے ایثار کی مشق شروع ہو گئی۔ خواہ اس ملّتِ بیضا کے افراد کسی دور دراز ملک میں مصائب میں گرفتار، لیکن جہاد کے لئے آمادہ پیکار رہوں۔ اس وقت پاکستان جیسی ایک عظیم اسلامی مملکت کا معرضِ وجود میں آنا کسی کے خواب میں بھی نہ آسکتا تھا۔ اقبال نے جذبۂ ملّی کو اُبھارنا اور مسلمانوں کے قلوب کو گرمانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس سے کچھ عرصہ قبل فرنگ میں بیٹھے ہوئے علی گڑھ کے طلباء کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ صبر سے کام لو عمل کا وقت ابھی نہیں آیا :

عجلت کرو نہ میکشو بادہ ہے نارسا ابھی[1]　　رہنے دو خُم کے مُنہ پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

---

[1] بانگِ درا میں اقبال نے یہ مصرع بدل دیا :

بادہ ہے نیم رس ابھی نالہ ہے نارسا ابھی　　رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

پاکستان بہت حد تک اقبال ہی کی کوششوں سے بنا۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنہوں نے خم کے مُنہ سے خشتِ کلیسیا کو ہٹتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا۔ اگرچہ جو آنکھیں اب اس کو دیکھ رہی ہیں ان کی بصارت بھی بہت کچھ اقبال ہی کی بصیرت کی رہینِ منت ہے۔ اس قصۂ کہن کو دُہرانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ غلام محمد اور ان کی قسم کے بہت سے اور روشن ضمیر اور نورِ ایمان سے مستنیر سید کے علی گڑھ کالج سے کچھ جذبات اور میلانات لے کر نکلے تھے جو بعد میں پاکستان کی تاسیس و تعمیر میں صورت پذیر ہوئے۔ علی گڑھ میں جس غلام محمد نے اپنی نصف خوراک چھوڑ دی تھی اس نے ٹاٹا سے ملنے والی تنخواہ سے نصف تنخواہ پر پاکستان میں وزیر مالیات بننا بخوشی قبول کر لیا۔

ترکوں کے ساتھ علی گڑھ والوں کا رابطہ ڈاکٹر انصاری کے لمبی مشن کی بدلت اور استوار ہو گیا تھا۔ انقلاب آفریں ترکوں میں سربرآوردہ عمائدین کے ساتھ غلام محمد کا گہرا قلبی تعلق بدستور قائم رہا۔ رؤف بے سابق وزیراعظم ترکی جو جدید ترکی کے معماروں میں سے ہیں جب مصطفیٰ کمال سے اختلاف کی بنا پر کچھ عرصہ کے لئے جلاوطن ہو گئے اور احباب کی دعوت پر ہندوستان آئے تو غلام محمد اس وقت کلکتہ میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے رؤف بے کی درویشانہ سیرت کے بہت سے قصّے بیان کئے۔ رؤف بے کے پاس ایک کچّی کوڑی نہ تھی، لیکن فقر و غنا کا یہ حال تھا کہ کسی سے بھی کسی صورت میں نہ کچھ طلب کرتے تھے اور نہ کسی کی پیش کش کو قبول کرتے تھے۔ بس جس نے دو روٹیاں کھلا دیں اس کو خوشی سے قبول کر لیا۔ غلام محمد صاحب نے بیان کیا کہ ہم نے دیکھا کہ گرمی کا زمانہ ہے اور رؤف بے کے پاس دو ٹھنڈے سوٹ بھی نہیں ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم ان سے کہیں کہ ہم دو چار سوٹ بنوا دیتے ہیں تو وہ کبھی نہ مانیں گے۔ غلام محمد منصوبہ سازی میں ہمیشہ سے ید طولےٰ رکھتے تھے۔ اُنہوں نے یہ پلین بنائی کہ ان سے درخواست کریں کہ فلاں اخبار (مجھے یاد نہیں کہ کون سا اخبار تھا) کے لئے آپ ایک مختصر سا کالم لکھ دیں۔ رؤف بے نے کہا کہ میں اخباروں رسالوں میں مضمون نہیں لکھا کرتا۔ لیکن جب مسلسل اصرار کیا تو ان کو آمادہ کر لیا۔ وہ بیچارہ یہ نہ سمجھ سکا کہ علی گڑھ کے ان شریروں کی یہ کیا چال ہے۔ اس کے بعد ایک رقم اپنی طرف سے ان کو پیش کر دی کہ اخبار کے ایڈیٹر نے اس کالم کا معاوضہ بھیجا ہے۔ وہ روپے تھوڑے ہی تھے۔ مگر غلام محمد نے ان سے کہا کہ اس کے دو تین چینی ریشم کے سوٹ کیوں نہیں بنوا لیتے۔ رؤف بے نے کہا کہ ان چند روپوں میں سوٹ کہاں سے بن سکتے ہیں۔ غلام محمد نے دروغ مصلحت آمیز کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ چینی ریشم سوٹوں کے لئے یہاں بہت سستا یعنی روپے کا دو گز ملتا ہے اور چھ گز میں سوٹ بن جاتا ہے۔ رؤف بے کو یقین نہ آیا تو کہا کہ میرے ساتھ دکانوں پر چلئے اور خود دریافت فرما لیجئے۔ دو چار کپڑے

والوں سے غلام محمد پہلے ہی کہہ آئے تھے کہ میں ایک صاحب کے ساتھ تمہاری دوکان میں سوٹوں کے ریشم کا بھاؤ پوچھنے آؤں گا جو ریشم بھی وہ پسند کریں اس کی قیمت آٹھ آنے گز بتانا۔ اب وہ رؤوف صاحب کو ہمراہ لے کر ایک دوکان میں گھسے۔ کہا کہ سوٹوں کا ریشم دکھاؤ۔ اچھا ریشم چُن کر قیمت پوچھی تو آٹھ آنے گز۔ رؤوف بے کو اس ارزانی پر بہت تعجّب ہوا۔ اس کے بعد دوسری اور تیسری دکان میں گئے اچھے سے اچھا ریشم مگر قیمت وہی آٹھ آنے گز۔ آخر دو تین سوٹوں کا کپڑا اخبار سے حاصل کردہ مفروضہ رقم سے خرید کر سوٹ بنوائے اور اُن کے حوالے کئے۔ فرماتے تھے کہ رؤوف بے کی خودداری کا یہ حال تھا کہ نواب بھوپال نے، جو علی گڑھ کے طالب علم اور غلام محمد اور خود میرے ہم جماعت تھے، ان کو پانسو روپے ماہوار کا وظیفہ پیش کیا۔ روف بے نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ نواب صاحب کی غریب رعایا کو میرے مقابلے میں اس رقم کی زیادہ ضرورت ہے۔ (ہمارے نام نہاد علماء اور مشائخ اپنی سیرت کا اس سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں)۔

ترکوں کے علاوہ دیگر اسلامی اقوام سے رابطۂ اخوت و اتحاد کو مضبوط کرنا ہمیشہ غلام محمد صاحب کے مدِّنظر رہتا تھا اور وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مواقع کی تلاش کرتے رہتے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ مواقع پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مرحوم کے صفات میں سے ایک غیر معمولی صفت ایسے لوگوں سے ذاتی طور پر دوستی پیدا کرنا تھا جنہیں وہ دوستی کے قابل سمجھتے تھے۔ کبھی ذاتی جذبات اور کبھی مفادِ ملّت دوستی کے محرکات ہوتے تھے۔ اسلامی جذبے سے یا سیاسی مصلحت سے دیگر اقوام کے جن ذی اقتدار لوگوں سے وہ رابطۂ مؤدت کو اہم سمجھتے تھے انہیں چند ہی ملاقاتوں میں اپنا اور پاکستان کا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ایک روز فرماتے تھے کہ نہ سفارتوں کی رسمی کارروائیوں سے کام چلتا ہے اور نہ ہی پاکستان کی حمایت میں طویل تقریروں سے۔ جس امیر مملکت یا وزیرِ دولت سے کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ کام لینا مقصود ہو اس سے ذاتی بنا پر دوستی کا تعلق پیدا کر لو تو بڑے بڑے اہم مقاصد آناً فاناً پورے ہو جاتے ہیں۔ قبلِ تقسیم ہندوستان میں کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر جن میں جواہر لال نہرو بھی تھے، ان سے دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح مسلم قائدین محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، اور اسی طرح صفِ دوم کے مسلمان لیڈر بھی ان سے ایسے بے تکلّف تھے کہ ان کو غلام محمد نہیں بلکہ "او گامے" کہہ کر پکارتے تھے (پنجاب کے عوام غلام محمد نامی لوگوں کو اختصار سے یا پیار سے گاما ہی پکارتے ہیں)۔ وہ بادشاہوں سے بھی اس قدر بے تکلف بات کرتے تھے کہ ان جلالت مآب حضرات سے مرعوب ہونے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ غلام محمد جیسے دبنگ انسان کے سوا اور کون ہو سکتا تھا جو شاہِ ایران کو

روبرو کہہ دے کہ حضرت بادشاہی کا جواز اسلام میں نہیں ہے۔ یہ شاہی اسلامی ممالک میں بھی اب چند روزہ ہی ہے۔ (یہ بات اُنہوں نے خود راقم الحروف سے بیان کی)۔ ان کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اسلامی ممالک سے قریبی روابط پیدا کرنے کے لئے جتنے وسائل بھی ہوں کان کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ فینانس منسٹری کے زمانے میں انہیں یہ سوجھا کہ ایک بین الاقوامی اسلامی معاشی کانفرنس کو کراچی میں منعقد کیا جائے۔ اور اس غرض سے ایک مستقل مجلس قائم کی جائے۔ جس کا ایک الگ سکریٹریٹ ہو۔ اس کانفرنس میں اُنہوں نے جو طویل اور بلیغ خطبہ پڑھا وہ ایسا عالمانہ تھا کہ اب تک اسلامی معاشیات کے متعلق مضامین اور کتابوں میں اس کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔

## دفاعی معاہدے

آج کل پاکستان میں انگریزوں کی مصر پر یورش کی وجہ سے بعض لوگ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ پاکستان بغداد کے معاہدے کو منسوخ کر دے۔ یا کم از کم انگریزوں کو اس میں سے خارج کر کے اس کو خالص اسلامی ممالک کا معاہدہ بنا دیا جائے اور اس کو وسیع کر کے مشرقِ وسطیٰ کی تمام اسلامی اقوام کو اس میں منسلک کیا جائے۔ عوام رموزِ مملکت اور سیاسی مصلحتوں سے ناآشنا ہوتے ہیں اور تمام حالات اور کوائف پر ایک محیط نظر نہیں ڈال سکتے۔ اس معاہدے میں جو قوم بھی داخل ہوئی وہ اپنی غرض اور مصلحت سے شریک ہوئی۔ روس کی دیرینہ دشمنی کی وجہ سے ترکوں کا جغرافیائی اور سیاسی موقف اس قسم کا ہے کہ انہیں ایسے حلیفوں کی شدید ضرورت ہے جو ان کو روس جیسی زبردست قوت سے بچا سکیں۔ روس درۂ دانیال پر قابض ہو کر بحیرۂ روم میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اور استنبول پر قبضہ شہنشاہی روس کا بھی مطمح نظر تھا۔ اشتراکی روس میں بھی یہ تمنّا موجود ہے اور اسکی موجودہ قوت کے مدِّ نظر یہ اس کے لئے آسانی سے قابلِ حصول ہے، اگر ترکی جیسا چھوٹا ملک بے حلیف ہو کر رہ جائے۔ اسی وجہ سے ترکی نارتھ اٹلانٹک نظامِ دفاع میں شامل ہو گیا۔ روس سے بچنے کے لئے جہاں بھی کوئی محاذ ہو گا ترکی محض اپنی بقا کی خاطر اس میں لازماً شریک ہو جائے گا۔ معاہدۂ بغداد کا مقصد روس کے خلاف ایک دفاعی محاذ قائم کرنا تھا۔ انگریز اس میں اس لئے شریک ہوئے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ کے تیل کو اپنے زیرِ اقتدار رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کی صنعتی اور معاشی زندگی اسی تیل کے بل پر قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان اس میں کاہے کو شریک ہوا۔ پاکستان کو اس سے کیا حاصل ہوا یا کیا حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اس معاہدے کا ذکر میں غلام محمد صاحب کی سیاست کے بارے میں اس لئے کر رہا ہوں

کہ وہ نہ صرف اس معاہدے کے حامی تھے بلکہ یہ بہت کچھ ان کے سیاسی شعور کا نتیجہ تھا کہ پاکستان اس معاہدے میں شریک ہؤا۔ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ ترکی اس میں کیوں شریک ہؤا اور انگریز کیوں اس کے محرک یا موید ہوئے۔ پاکستان کو اس میں شریک ہونے کی کیا ضرورت تھی اس کو سرکاری طور پر کبھی ہماری حکومت نے بیان نہیں کیا۔ اظہارِ خیال یا اخفائے خیال حکومتیں اپنی مصلحت سے کرتی ہیں لیکن چونکہ ہم حکومت کے کوئی پُرزے نہیں ہیں اس لئے ہمیں اس بات کو من و عن لکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ جس طرح ترکی کا جانی دشمن روس ہے اسی طرح پاکستان کا کھلا دشمن بھارت ہے۔ بھارت کو انگریز نہایت قوی کر کے چھوڑ گیا۔ انگریزوں نے اسلح کے بیش بہا کارخانے بھارت میں چھوڑے۔ جاپانیوں کے خلاف تیار کردہ خوفناک جنگی سامان ہندوؤں کے قبضے میں آیا۔

بھارت نے اپنی دولت، وسعتِ ملک اور عسکری قوت کے مقابلے میں پاکستان کو کمزور اور بے بس سمجھ کر بات بات پر اس کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ کبھی مغربی پاکستان کی سرحد پر اور کبھی مشرقی پاکستان کے قریب اپنی افواج کا کثیر حصّہ لا ڈالا اور پاکستان پر حملہ آور ہونے کے بہانے تراشنے لگا۔ بھارت اور پاکستان کی سرحدیں اتنی طویل ہیں کہ جنگ کی حالت میں اکیلا پاکستان آسانی سے ان کا دفاع نہیں کر سکتا۔ بھارت نے اپنی عسکری قوت زیادہ تر پاکستان کو ڈرانے دھمکانے کے لئے پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھا لی ہے اور یہ اضافہ روز افزوں ہے۔ بھارت سے کوئی پوچھے کہ یہ مہاتما گاندھی کے عدم تشدّد کا رام راجیہ ملک کس کے خلاف یہ خوفناک عسکری قوّت پیدا کر رہا ہے۔ اسے نہ چین سے خطرہ ہے اور نہ روس سے جنگ کا کوئی بعید گمان بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جنگ میں روس کے مقابلے میں بھارت ایک دن بھی نہیں ٹھیر سکتا۔ جس قوّت سے تمام یورپ اور امریکہ لرزہ براندام ہے اس کے مقابلے کے لئے بھلا بھارت کیا تیاریاں کر سکتا ہے۔ یہ سب بھارتی عسکری قوت جو اپنی رعایا کو بھوکا ننگا رکھ کر پیدا کی جاتی ہے اس کا ایک ہی واحد مقصد ہے اور وہ پاکستان کو مرعوب کرنا۔ یہ زمانہ ایسا نہیں ہے کہ پاکستان جیسے چھوٹے اور مفلس ملک کسی زبردست انسانیت سوز ہمسایہ دشمن کا مقابلہ حلیفوں کے بغیر کر سکیں۔ حلیفوں کی ضرورت تو پاکستان سے دس گنا زیادہ قوی قوموں کو بھی اس پر مجبور کر رہی ہے کہ قوی تر ظالموں کی تعدّی سے بچنا چاہو تو کچھ ایسے حلیف پیدا کر لو جو بوقتِ ضرورت تمہاری مؤثر حمایت پر آمادہ ہو جائیں۔ مصر ہی کو دیکھ لیجئے۔ اگر انگریزوں اور امریکیوں سے ناامید ہو کر اس نے روس اور دیگر اشتراکی ممالک سے رابطہ پیدا نہ کیا ہوتا تو انگریز، فرانسیسی اور یہودی مل کر اس کے پرخچے اڑا دیتے۔ روس کی ایک ہی دھمکی نے ان کا مزاج درست کر دیا۔ بغداد پیکٹ کے متعلق لوگ غلام محمد کو مطعون کرتے

ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس معاہدے کی وجہ سے پنڈت نہرو کے پیٹ میں کیوں آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔ اس معاہدے کے آغاز سے لے کر اب تک پنڈت نہرو اس کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔ اگر پاکستان اس معاہدے میں روس کے خوف سے شریک ہوتا تو پنڈت صاحب اس قدر برافروختہ نہ ہوتے۔

معاہدۂ بغداد یہ ہے کہ ان معاہدا قوام کی سرحدوں پر اگر کسی نے جارحانہ کارروائی کی، جنگ کی دھمکی دی یا جنگ شروع کی تو یہ اقوام مل کر اس کا مقابلہ کریں گی۔ یہ درست ہے کہ عسکری لحاظ سے ایران یا عراق ہماری قابلِ ذکر مدد نہیں کر سکتے، لیکن ان میں انگریز بھی اپنے مفاد کی خاطر موجود ہے جس کی قوت اور اعانت سے پنڈت نہرو گھبراتے ہیں۔ کیا پاکستانی لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اس معاہدے کے بعد سے پنڈت جی مسلسل ماتم تو کرتے ہیں لیکن پاکستان کی سرحدوں پر فوجیں اکٹھا کرنے کی دھمکی ختم ہو گئی ہے۔ معاہدۂ بغداد میں ہمیں انگریز کو شریک رکھنے کا ایک اہم مقصد یہی تھا کہ پنڈت جی کے دماغ سے پاکستان پر حملہ آوری کا جنون نکل جائے۔ غلام محمد مرحوم اس معاہدے سے دو گونہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک یہ کہ بھارت کو یہ معلوم ہو جائے کہ تقسیم کر کے ہندوستان کا ملک چھوڑنے کے بعد انگریز بھارت کو پاکستان کے خلاف نہ اکسائے گا اور نہ اس کی براہِ راست اس معاملے میں مدد کرے گا۔ نیز یہ کہ انگریزوں کو دفاعی معاہدے میں شریک کر کے پاکستان کی سالمیت کو محفوظ کیا جائے کیونکہ پاکستان کو ابھی حفاظت کی ضرورت ہے اور اگر انگریز بھارت کو ایک بڑا ملک سمجھ کر پاکستان کے خلاف اس کا معاون ہو گیا تو پاکستان بے یار و مددگار رہ جائے گا۔ نہ روسی اس کی امداد کو پہنچیں گے اور نہ امریکی۔ دوسرا مقصد سیاسی سمجھ لیجئے یا مذہبی یا جذباتی اور وہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اسلامی ممالک سے رشتۂ اتحاد مضبوط ہونا چاہیئے۔ بھارت کے ساتھ اور اس کی شہ سے افغانستان ہمارا دشمن ہو گیا ہے اور وہ کسی معقول برادرانہ سمجھوتے کی طرف آتا ہی نہیں۔ پاکستان کی تمام کوششیں اس بارے میں بے نتیجہ رہیں اور پاکستان کے لئے خطرہ بڑھ گیا۔ لازمی طور پر ہم کو ایران، عراق اور ترکی سے دفاعی معاہدہ کرنا پڑا۔ اس معاہدے میں انگریز اپنی غرض سے شریک ہوا۔ لیکن پاکستان نہ تب اس کے لئے تیار تھا اور نہ اب تیار ہے اور نہ کبھی تیار ہو گا، کہ انگریزوں کے استعمار کو مشرقِ وسطیٰ میں قوی بنانے میں ممد ہو یا کسی اسلامی ملک کے خلاف کسی معاملے میں بھی انگریزوں کی مدد کی جائے۔ ایک طرف بھارت جیسے دشمن سے بچاؤ اور دوسری طرف اسلامی ممالک سے اتحاد و وفاق کا آغاز معاہدہ کا مقصد ہے۔ پاکستان کے ناعاقبت ہنگامہ آرا ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ کر یہ بتائیں کہ ان دو مقاصد میں سے کون سا مقصد غلط یا پاکستان کے لئے مضر ہے۔

یہی حال جنوب مشرقی ایشیائی معاہدے کا ہے جس میں فرانسیسی جیسی بدبخت قوم بھی شامل ہے۔

اس علاقے میں بھی انگریز ہوں یا فرانسیسی یا امریکی، سب اپنے اپنے مفاد کو مدِ نظر رکھ کر شریک ہوئے اور یہ ظاہر ہے کہ قومیں اور مملکتیں سب سے پہلے اپنے مفاد ہی کو مدِ نظر رکھ کر عمل کرتی ہیں۔ پاکستان بھی اس معاہدے میں اپنی حفاظت کے لئے شریک ہوا۔ کیونکہ عسکری حیثیت میں مشرقی بنگال کا دفاع بھارت کے خلاف پاکستان کے لئے ایک بڑا کٹھن معاملہ ہے۔ بھارت آمادۂ جنگ ہوا تو پاکستان کو دو دور دراز محاذوں پر اپنا بچاؤ کرنا ہوگا۔ ان معاہدوں سے بہت قبل ایک مقتدر ترک سیاسی لیڈر نے پاکستان کے ایک نمائندے سے کہا کہ ترک سپاہیوں کی بہادری مشہور ہے لیکن ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک ترکوں کو یہی مصیبت رہی کہ ممالک محروسہ کے کئی حصّے دور افتادہ تھے اور ترکوں کو کئی محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑتا تھا۔ اس نے کہا کہ ہمیں خطرہ ہے کہ بھارت نے اگر کبھی جنگ چھیڑ دی تو تمہیں دو محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑیگا جن کے درمیان میں ہزار میل کا دشمن ملک موجود ہے۔ دشمن کو ہر طرح کی آسانیاں ہونگی اور تم کو ناقابلِ حل مشکلات۔ مشرقی پاکستان کو محفوظ کرنے ہی کے لئے یہ ضرورت پیش آئی کہ دو تین زبردست حلیف پیدا کئے جائیں جو مشرقی پاکستان پر بھارت کے حملے کے وقت بھارت پر سیاسی یا عسکری دباؤ ڈال سکیں۔ ایک حدیث نبویؐ کا یہ مضمون ہے کہ بعض اوقات کسی مردِ فاسق سے بھی اسلام کی اعانت ہو جاتی ہے۔ انگریز اور فرانسیسی سیاست میں جا بجا فسق و فجور کا ثبوت دیتے ہیں، لیکن اگر ہمارے کسی قریبی دشمن کے خلاف کسی معاہدے کی رُو سے ان پر ہماری اعانت فرض ہو جائے تو اس میں کیا نقصان ہے۔ پاکستان کا اوّلین فرض اپنی ملکی سالمیت کو محفوظ کرنا ہے۔ انہیں دو معاہدوں کی وجہ سے پاکستان میں روس دوست اور اشتراکیت پسندوں نے، جو پاکستان کو غیر جانبداری کی آڑ میں اشتراکی ممالک کا حلیف بنانا چاہتے ہیں، ایک ہنگامہ بپا کر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے غلام محمد جیسے معمارِ ملّت کی وفات پر ایک کلمۂ خیر اُن کی زبان سے نہیں نکلا۔

یہ لوگ یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ پاکستان برٹش کومن ویلتھ سے نکل جائے اور انگریزوں کو اپنا مخالف بنا ڈالے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ پنڈت نہرو جو انگریزوں کی امپیریلزم کے خلاف ہر موقع پر احتجاج کرتا رہتا ہے، اور جس نے مشرقی قوموں کو غیر جانبدار رہنے کی تلقین بے وقوفوں سے داد لینے کے لئے اپنا شغل بنا رکھا ہے، وہ مصر کی حمایت میں پاکستان سے دو قدم آگے رہنے کی کوشش اور انگریزوں کی مصر پر اس ظالمانہ یورش کے باوجود برٹش کومن ویلتھ سے کیوں قطع تعلق نہیں کرتا۔ وجہ صرف یہی ہے کہ اس کو خطرہ ہے کہ اگر بھارت برٹش کامن ویلتھ سے نکل جائے اور پاکستان اس میں بدستور موجود رہے تو انگریز بھارت کے خلاف پاکستان کے حامی ہو جائیں گے۔ ہندوؤں اور

مسلمانوں میں یہی بیّن فرق ہے کہ ہندو قوم اور اس کے لیڈر اپنے مقصد کو خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن نافہم یا کج فہم مسلمان عوام جنہیں بعض مسلمان سیّاس اپنا آلۂ کار بناتے ہیں یہ نہیں سمجھ سکتے کہ پاکستان کو بھارت سے محفوظ رکھنے کے لئے ہمیں قوی حلیفوں کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ حلیف ایسے ہوں جن کے بعض اعمال کی وجہ سے ہم انہیں ملعون قرار دیں۔ سیاسی اتحاد، دوستی یا محبت کی بنا پر نہیں ہوتا اور سیاسیات میں مخالفت یا موافقت دین یا اخلاق ہی کی بنا پر نہیں ہوتی۔ آغاز اسلام میں بھی بعض اوقات کفّار مسلمانوں کے حلیف ہو کر ان کی طرف سے لڑے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی اکبر نے ہندو راجپوتوں کو اپنا حلیف بنا کر سلطنت کو وسعت دی اور اس کو ایسا استوار کیا کہ اس کے بعد جہانگیر اور شاہجہان جیسے بے ہمت اور عیش پرست جانشینوں کے باوجود وہ سلطنت قائم رہی۔

(باقی آیندہ)

---


## حکمتِ رومی

مصنّفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب
قیمت تین روپے

## حیاتِ محمدؐ

مصنّفہ محمد حسین ہیکل پاشا
مترجمہ ابو یحییٰ امام خاں صاحب
قیمت اٹھارہ روپے بارہ آنے

مآثر لاہور

مصنّفہ جناب سیّد ہاشمی فرید آبادی
قیمت تین روپے

## افکارِ غزالی

مصنّفہ مولانا محمد حنیف ندوی
قیمت سات روپے

ملنے کا پتہ :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ - ۲ کلب روڈ - لاہور